تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل

(۵)

سیاسی تحریک کو معطل کرنے کے دلائل و وجوہ جہاں تک میں معلوم کر سکا ہوں، وہ وجوہ جن کی بنا پر بعض ذہنوں میں لائحہ عمل کے سیاسی جُز کو معطّل یا مؤخر کرنے کا تخیل پیدا ہوا ہے صرف تین ہیں، اور میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کا بھی اچھی طرح جائزہ لے کر دیکھ لیں کہ آیا وہ ایسی کسی تجویز کے لیے واقعی معقول وجوہ ہیں۔

پہلی وجہ اور اس کا تنقیدی جائزہ پہلی اور سب سے بڑی، بلکہ اصل وجہ جو مختلف مواقع پر میں نے سنی ہے، یہ ہے کہ ان کے نزدیک جماعت کی دینی و اخلاقی حالت گر گئی ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ پہلے سیاسی جدوجہد سے ہٹ کر کارکنوں کے اخلاق بنائے جائیں، پھر اس میدان میں واپس آیا جائے۔

اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ اگر ساری جماعت بحیثیت مجموعی بگڑ گئی ہے تو اسے توڑ دیجیے، کیونکہ ہم بگاڑ کو سنوارنے کے لیے اٹھے تھے، بگڑی ہوئی جماعتوں میں ایک اور جماعت کا اضافہ کرنے کے لیے نہیں اٹھے تھے۔ لیکن اگر پورے مجموعے پر یہ ہمہ گیر حکم محض مبالغہ ہے، اور امر واقعی صرف اس قدر ہے کہ جماعت میں کچھ افراد معیار سے گرے ہوئے پائے جاتے ہیں، تو اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ سارا قافلہ ان چند افراد کی خاطر رک کر کھڑا ہو جائے، اور جب تک وہ درست نہ ہو جائیں آگے کا سفر ملتوی رہے۔ بلکہ اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ جماعت کے معروف طریقے کے مطابق ایسے ناکارہ لوگوں کو یا تو درست کیجیے یا پھر جماعت سے خارج کر دیجیے، مگر قافلہ کی راہ ایک لمحہ کے لیے بھی کھوٹی نہ کیجیے۔ جماعت اسلامی کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ یہ جماعت آخر کب اس طریقے پر عامل رہی تھی کہ جو لوگ ایک دفعہ اس کے نظام میں آ گئے ہوں وہ خواہ معیار پر قائم رہیں یا اس سے گر جائیں، ان کو ہر حال میں اپنے سینے سے چمٹائے رکھا جائے۔ اور ناکارہ لوگوں کو نکالنے کے بجائے جماعت اپنے پروگرام ان کی وجہ سے بدل دیا کرے؟ اس نے تو اوّل روز سے اپنے ہاں تنقید اور محاسبہ کا طریقہ اختیار کیا تھا تاکہ ہمیشہ کارکنوں کی حالت کا

جائزہ لے کر دیکھا جاتا رہے کہ وہ کم سے کم معیار جو رکنیت کے لیے مطلوب ہے، ان میں پایا جاتا ہے یا نہیں پھر جسے بھی معیار سے گرتے دیکھا جائے، اس کے تمام رفقاء اسے سنبھالنے کی فکر کریں، اور اگر وہ نہ سنبھلے تو پھر بادلِ ناخواستہ اسے رخصت کر دیا جائے۔ اس قاعدے کے مطابق ابتدا سے جماعت میں داخلے کا سلسلہ جس طرح چلتا رہا ہے اسی طرح اخراج کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے، حتیٰ کہ سنہ ۴۵-۱۹۴۴ء میں ایک سال کے اندر تین سو ارکان کا اخراج تک عمل میں آ چکا ہے[1]۔ یہ قاعدہ آج بھی آپ کی جماعت میں موجود ہے، اور آپ اس پر عمل کر کے جماعت کو ایسے تمام عناصر سے خالی کر سکتے ہیں جن کی دینی و اخلاقی حالت گر گئی ہو۔ ایسے لوگ اگر آپ کے اندر آج پائے جا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی جماعت کے اس معروف قاعدے پر عمل کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ اب یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اسے تازہ کرنے اور اس پر ٹھیک ٹھیک عملدرآمد کرنے کے بجائے ہمارے سامنے الٹی یہ تجویز لائی جاتی ہے کہ جماعت ان لوگوں کو اپنے اندر رکھنے کی خاطر اُس پروگرام میں رد و بدل کر ڈالے جو اس کے نصب العین کا لازمی تقاضا ہے۔

پھر میں کہتا ہوں کہ اگر اس پروگرام کے سیاسی جُز کو معطل کرنا اس لیے ناگزیر ہو گیا ہے کہ جماعت میں کچھ عناصر دینی و اخلاقی حیثیت سے گر گئے ہیں تو اس سے زیادہ ناگزیر یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ معاشرہ اور توسیعِ جماعت کے کام کو بھی معطل کر دیا جائے، کیونکہ گری ہوئی دینی و اخلاقی حالت کے ساتھ دعوت الی اللہ کیسی، اور معاشرے کی اصلاح کے کیا معنی، اور صالح افراد کی تلاش و تنظیم کا کیا موقع؟ اس دلیل سے تو جماعت کا پروگرام اب صرف اپنے موجودہ ارکان کی تربیت تک محدود رہنا چاہیے، اور یہ طے ہو جانا چاہیے کہ جب تک سارے ارکان پورے معیاری رُکن نہ ہو جائیں، پبلک میں جا کر کوئی دعوتی یا اصلاحی یا سیاسی کام نہ کیا جائے۔ نیز یہ بھی طے ہو جانا چاہیے کہ جب بھی ارکان کی حالت کا جائزہ لینے کے بعد یہ پتہ چلے کہ تربیت کی ساری کوششوں کے باوجود پھر کچھ لوگ جماعت میں دینی و اخلاقی حیثیت سے گرے ہوئے پائے جاتے ہیں، تو پھر اسی طرح سارے پروگرام معطل کر کے جماعت تربیت گاہوں کی طرف

[1] روداد جماعت حصہ سوم صفحہ ۱۴۳۔۱۴۴۔ واضح رہے کہ اُس سال کے آغاز میں ارکان کی کل تعداد ساڑھے سات سو تھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ۴۰ فی صدی ارکان ناکارہ پا کر خارج کیے گئے۔

پلٹ جایا کرے گی۔ اس کے بعد یہ سوال خارج از بحث فرما دیجیے کہ یہ جماعت کبھی کوئی کام کر بھی سکے گی یا نہیں۔ میرے علم میں ایسا کوئی طریقِ تربیت اب تک نہیں آیا ہے جو معیارِ مطلوب کے آدمی تیار کرنے کی سو فی صدی ضمانت دیتا ہو۔ اس کی آپ جتنی چاہیں کوشش کر دیکھیں، ہر جائزہ آپ کو یہی رپورٹ دے گا کہ آپ کے درمیان ایک ناقابلِ اطمینان عنصر موجود ہے۔ بلکہ بحیثیتِ مجموعی پوری جماعت کے متعلق بھی ہر پہلو سے کامل اطمینان کی رپورٹ شاید آپ کبھی نہ پا سکیں گے۔ اب اگر یہ بات آپ ایک دفعہ طے کر لیں کہ ایسے جائزوں کا نتیجہ ہمیشہ آپ کے پروگراموں کو معطل کرنے ہی کی صورت میں نکلنا چاہیے تو میرے نزدیک اس کے بعد عقلمندی یہ ہے کہ آپ نظامِ زندگی کے انقلاب کی داستان لپیٹ کر رکھ دیں اور خانقاہیں بنانے کی تجویزیں سوچیں۔ اس کمزوری کے ساتھ آپ اجتماعی زندگی میں کبھی کوئی مؤثر کام نہیں کر سکتے۔

یہ تو ہے اس طرزِ فکر کا ایک کمزور پہلو۔ دوسرا اس سے بھی زیادہ کمزور پہلو یہ ہے کہ اس تجویز میں اخلاق بنانے اور مردانِ کار تیار کرنے کا ایک ایسا تصور کام کر رہا ہے جو بنیادی طور پر غلط ہے، اور میرے لیے یہ بات سخت حیرانی ہی نہیں، پریشانی کی موجب بھی ہے کہ سالہا سال سے ہم سیرت و اخلاق کی تیاری کے جس تصور کی اصلاح کے لیے کوشش کر رہے ہیں وہ ہمارے دائرے میں کیسے راہ پا گیا۔ یہ کہنا کہ جماعتِ اسلامی سیاسی جدوجہد کے میدان سے ہٹ کر پہلے کارکنوں کے اخلاق بنائے پھر اس میدان میں قدم رکھے، اپنے پیچھے اخلاق کی تیاری کا یہ تصور رکھتا ہے کہ ایک کام کے لیے جس قسم کے اخلاق کی ضرورت ہے وہ اُس کام میں پڑے بغیر کہیں باہر سے تیار کر کے لائے جا سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ تصور اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ خیال غلط ہے کہ کوئی آدمی پانی میں اُترے بغیر بھی تیراک ہو سکتا ہے۔ عقل اس کو غلط کہتی ہے۔ بارہا کے تجربات اس کو غلط ثابت کر چکے ہیں۔ ہمارا شب و روز کا مشاہدہ اس کی تردید کر رہا ہے۔ یہ بات تو روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ ہر کام کے لیے جس قسم کے اخلاق مطلوب ہوتے ہیں وہ اسی کام میں پڑ کر بنتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ کے لیے جو اخلاق درکار ہیں وہ دعوت و تبلیغ ہی میں بنیں گے۔ تجارت کے لیے جو اخلاق درکار ہیں وہ دکان اور منڈی ہی میں بنا ہوں گے۔ حجروں میں بیٹھ کر آپ دس برس بھی مشق و تمرین کریں، دعوت یا تجارت کے میدان میں قدم رکھتے ہی آپ کو محسوس ہو گا کہ یہاں جن آزمائشوں سے سابقہ ہے ان کے مقابلے میں اخلاقی حیثیت سے آپ بالکل مبتدی کے مقام پر ہیں۔ ایسا ہی معاملہ سیاست اور انتخابات کا بھی ہے۔

اس کام کی اخلاقی مشکلات، اور اس میں اترنے کے خطرات و نقصانات کو دیکھ کر آپ یہ فیصلہ کرنا چاہیں تو کر لیجیے کہ ہمیں اس میدان سے ہمیشہ کے لیے ہٹ جانا ہے۔ مگر یہ محض ایک خام خیالی ہے کہ آپ کا ارادہ تو اس میدان میں واپس ہی آنے کا ہو، لیکن آج آپ اس سے اس لیے ہٹ جائیں کہ چند سال تک آپ کہیں وہ اخلاق تیار کرتے رہیں گے جو سیاسی کام اور انتخابات میں حصہ لینے کے لیے درکار ہیں۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جتنے سال بھی آپ چاہیں اس میدان سے باہر تیاری کرتے رہیں آخر کار جب آپ پلٹ کر ادھر آئیں گے تو اپنے آپ کو آج کی حالت سے کچھ بھی بہتر نہ پائیں گے۔ یہاں جو اخلاقی قوت درکار ہے وہ باہر کسی جگہ سے بنا کر نہیں لائی جا سکتی۔ اس کا نشوونما اسی میدان میں شیطانی قوتوں سے نبرد آزمائی کر کے ہو سکتا ہے۔ اس کے انتقاد کی صورت صرف یہ ہے کہ آپ اپنے کارکنوں کو ایک نصب العین اور ایک ضابطۂ اخلاق دے کر سیاسی جدوجہد کے عرصۂ کارزار میں لائیں اور سخت سے سخت نازک مواقع پر بھی انہیں اس نصب العین اور ضابطۂ اخلاق سے ہٹنے نہ دیں۔ انہیں انتخابی معرکے میں ان پارٹیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھائیں جو اخلاق و دیانت کے سارے اصولوں کو توڑ کر بازی جیتنے کی کوشش کرتی ہیں اور پھر اس امر کی پوری نگرانی کریں کہ انتخابی جنگ کی انتہائی گہما گہمی میں بھی آپ کے کارکن اخلاق کے کسی ضابطے اور دیانت کی کسی حد کو توڑنے نہ پائیں۔ ان آزمائشوں میں جن لوگوں سے کسی لغزش کا صدور ہو، ان پر گرفت کیجیے، جو قابلِ اصلاح ہوں ان کی اصلاح کی کوشش کیجیے اور دیکھیے کہ بعد کی آزمائشوں میں وہ کیسے ثابت ہوتے ہیں، اور جن کی حالت ناقابلِ اصلاح پائی جائے انہیں ہٹا کر پھینک دیجیے۔ یہ عملی تربیت اسی تربیت گاہ میں مل سکتی ہے۔ باہر کہاں آپ یہ تربیت دیں گے، اور کیسے آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اخلاق جو اس کام کے لیے مطلوب ہیں، تیار ہوئے یا نہیں ہوئے؟

جماعت اسلامی کے لیے یہ کوئی نیا طریق تربیت نہیں ہے جو آج پہلی مرتبہ اس کے سامنے پیش کیا جا رہا ہو، بلکہ ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں وہ اس کو آزما چکی ہے، اور اس کے نتائج کا جائزہ بھی آپ اس سے پہلے اچھی طرح لے چکے ہیں۔ اُس وقت انتخابات کے فوراً بعد آپ کی مجلس شوریٰ نے جو تبصرہ ایک طویل قرارداد کی شکل میں جماعت کے انتخابی کام پر کیا تھا اس کے یہ فقرے ملاحظہ ہوں:

" اس انتخابی جدوجہد کے دوران میں عام پبلک میں سے سترہ سو ایسے نئے آدمی اٹھ کھڑے ہوئے جنھوں نے ہمارے کارکنوں کا پوری طرح سے ہاتھ بٹایا اور بغیر کسی ذاتی غرض یا لالچ کے اُن تمام اخلاقی پابندیوں کے ساتھ، جو ہم نے اپنے کارکنوں پر عائد کر رکھی تھیں، پوری طرح جان لڑا کر کام کیا۔"

" باوجودیکہ پنجاب کے اتنے وسیع رقبوں میں جماعت کے تین چار ہزار کارکنوں نے اتنے وسیع پیمانے پر انتخابی جدوجہد کی، اور اس میں مخالف جماعتوں اور امیدواروں کی شدید بداخلاقیوں اور بے ضابطگیوں کا ان کو مقابلہ کرنا پڑا، تاہم پولنگ کے انتہائی بحرانی زمانے میں بھی جماعت کے کارکنوں نے بحیثیت مجموعی اخلاقی طہارت اور ضابطہ و قانون کی پابندی کا ایسا بے نظیر نمونہ پیش کیا جس کا اعتراف حکومت کے عُمّال اور مخالف پارٹیوں کے کارکنوں تک کو کرنا پڑا۔ الیکشن کے پورے کام کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ دو چار حلقوں کے سوا پورے پنجاب میں کہیں جماعت کے کارکنوں سے کسی اخلاقی کمزوری، یا قانون و ضابطہ کی خلاف ورزی کا ارتکاب نہیں ہوا، اور ان دو چار حلقوں میں بھی جماعت کے کارکن بحیثیت مجموعی اس میں ملوث نہیں ہوئے بلکہ چند منفرد کارکنوں ـــــ اور زیادہ تر نئے کارکنوں ـــــ سے اس کا صدور ہوا۔"

" خصوصیت کے ساتھ جو چیز ہمارے لیے قابل اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ اس انتخابی جدوجہد میں جن خواتین نے پنچایتی نمائندوں کے لیے کام کیا انھوں نے ہر جگہ شرعی پردے کے تمام حدود کی پوری طرح پابندی کی۔ درانحالیکہ ایک آدھ پولنگ اسٹیشن کے سوا پورے پنجاب کا کوئی پولنگ اسٹیشن ایسا نہیں تھا جہاں زنانہ پولنگ کے وقت حکومت اور سیاسی پارٹیوں اور مخالف امیدواروں نے پردے کے حدود کا کچھ بھی لحاظ کیا ہو۔"

" جماعت کے کارکن پہلی مرتبہ انتخاب کے میدان میں اترے تھے۔ اکثر و بیشتر کو پہلے سے انتخاب کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اور اخلاقی قیود اور قانون و ضابطہ کی پوری پابندی کے ساتھ الیکشن لڑنے کا تو موجودہ جمہوریت کی تاریخ میں شاید یہ پہلا تجربہ تھا۔"[1]

[1] روداد مجلس شوریٰ، اپریل ۱۹۵۱ء، صفحہ ۸۰-۱۰۰

"آئندہ ہر انتخاب کے موقع پر یہ بات نہ صرف کارکنانِ جماعت پر، بلکہ جماعت کی حمایت میں جو لوگ کام کریں اُن پر بھی اچھی طرح واضح کر دی جائے کہ جماعتِ اسلامی انتخاب میں کسی نشست کو جیتنے کی بہ نسبت زیادہ، اور بدرجہا زیادہ اہمیت اس امر کو دیتی ہے کہ انتخابات کو بد اخلاقیوں اور بے ضابطگیوں سے پاک کیا جائے اور انتخابی جنگ میں اخلاقی حدود اور قانون و ضابطے کی پوری پوری پابندی کا نمونہ پیش کیا جائے۔ کیونکہ سیاست کو صداقت اور دیانت پر قائم کرنا جماعت اسلامی کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے، اور اس مقصد کو ہم کسی بڑے سے بڑے وقتی فائدے پر بھی قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس بنا پر مجلسِ شوریٰ نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ کسی ایسے رکنِ جماعت کو ہرگز معاف نہ کیا جائے جو کبھی انتخابی جدوجہد میں اخلاق اور ضابطے کے حدود سے تجاوز کرے۔ اور جماعت سے باہر کے جن لوگوں سے اس طرح کی حرکات کا صدور ہو آئندہ کے لیے ان کا تعاون قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے[۱]۔"

یہ ہے وہ طریقِ تربیت جس کا آپ پہلے تجربہ کر چکے ہیں، اور یہ ہیں اس کے نتائج جو آپ کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کے ۱۷ آدمیوں نے پورے انتخابی کام کا جائزہ لینے کے بعد ایک باقاعدہ قرارداد کی شکل میں بیان کیے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں، کیا یہ نتائج واقعی ایسے دل شکن اور مایوس کن ہیں کہ انہیں دیکھ کر آپ اس طریقے کو ناکام کہہ سکیں؟ اور کیا آپ سیاست اور انتخابات کے معرکے میں اترنے کے لیے یہ شرط لگانا چاہتے ہیں کہ تین چار ہزار آدمی اگر آپ میدان میں لائیں تو ان میں سے ایک کا کام بھی معیار سے گرا ہوا نہ پایا جا سکے؟ اور کونسا دوسرا طریقہ آپ تجویز کرتے ہیں جو اس میدان سے باہر آدمی تیار کرتا ہو اور پھر اس امر کی ضمانت دے کر انہیں میدان میں لا سکتا ہو کہ ہزار میں ایک آدمی بھی عملی تجربے میں ناقص نہ نکلے گا؟

اِس طرزِ فکر کا ایک کمزور پہلو اور بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جو حضرات یہ بات کہتے ہیں کہ اس وقت سیاست کے میدان سے ہٹ جائیے اور پھر چند سال اخلاق بنانے میں صرف

---

[۱] روداد مجلسِ شوریٰ، اپریل ۱۹۵۱ء، صفحہ ۲۲-۲۳۔

کر کے پوری تیاری کے ساتھ واپس آ جائیے۔ انھوں نے غالباً یہ فرض کر لیا ہے کہ ہم خلا میں کام کر رہے ہیں اور یہاں یہ بالکل آسان ہے کہ ہم جب چاہیں ایک جگہ سے ہٹ جائیں اور پھر جب چاہیں اسی جگہ آن کھڑے ہوں۔ حالانکہ امر واقعی جس سے ہم دوچار ہیں وہ یہ ہے کہ دس برس سے ہم سخت مزاحمتوں کے مقابلے میں اپنے نصب العین کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں، بہت سی طاقتیں ہیں جن سے ایک ایک قدم پر کشمکش کرتے ہوئے ہم اپنے موجودہ مقام پر پہنچے ہیں۔ اور وہ مخالف طاقتیں ہر وقت ہم کو ہٹانے اور دور پھینک دینے کے لیے زور لگا رہی ہیں۔ یہ کوئی خالی میدان نہیں ہے جس میں ہم ٹہلتے ہوئے آئے ہوں اور جا کر پھر ٹہلتے ہوئے ہی واپس آ سکتے ہوں۔ یہ تو مقابلے اور کشمکش کا میدان ہے جس میں ایک قدم بھی پیچھے ہٹ جائیے تو کھوئی ہوئی جگہ پر پلٹ کر آنا آسان نہیں ہوتا۔ اس لیے یہاں سے عام پسپائی کا فیصلہ محض خیالات کی چند لہروں سے متاثر ہو کر رواروی میں نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اوّل تو ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ سیاسی میدان میں کام کرنے سے وہ کونسا نقصان عظیم ہماری تحریک کو پہنچا ہے جس کے مقابلے میں یہ پورا میدان مخالفِ دین اور مخرّبِ اخلاق طاقتوں کے لیے خالی چھوڑ دینا کم تر درجے کا نقصان سمجھا جا سکے اور اس نقصان کو گوارا کرنا ہمارے لیے ناگزیر ہو چکا ہو۔ دوسری یہ بات ہمارے سامنے واضح ہونی چاہیے کہ یہاں سے ہٹ کر ہم پھر یہاں واپس آ بھی سکیں گے؟ اس لیے کہ جو چند سال ہم اخلاقی تیاریوں میں صرف کریں گے، ان میں مخالف طاقتیں بیکار نہیں بیٹھی رہیں گی، بلکہ یہی چند برس وہ اپنی جڑیں مضبوط کرنے اور آپ کی واپسی کا دروازہ بند کرنے میں صرف کریں گی، اور ان کی کوشش یہ ہوگی کہ اس ملک میں دینی نظام کے لیے جدوجہد کرنے کے مواقع حتی الامکان بالکل ختم کر دیئے جائیں۔ ان دو سوالات کا کوئی اطمینان بخش جواب جب تک نہ ملے، سیاسی میدان سے پسپائی کی کوئی تجویز ہمارے لیے لائقِ غور بھی نہیں ہو سکتی، کجا کہ آنکھیں بند کر کے اسے صرف اس لیے قبول کر لیا جائے کہ جماعت کی اخلاقی حالت گرنے کا ایک خطرہ ہمارے سامنے پیش کر دیا گیا ہے جو بجائے خود واقعہ کے اعتبار سے بھی نہایت مبالغہ آمیز ہے۔

دوسری وجہ دوسری وجہ اس تجویز کے حق میں یہ پیش کی جاتی ہے کہ ہمارے پاس وہ لوگ تیار نہیں ہیں جو نظامِ حکومت کو اسلامی طرز پر چلانے کے لائق ہوں۔ اس حالت میں اگر محض سیاسی جدوجہد سے قیادت

میں کوئی تبدیلی ہو بھی جائے تو آخر وہ لوگ ہم کہاں سے لائیں گے جو ریاست کے مختلف شعبوں کی صورت گری اور رہنمائی اسلامی اصولوں کے مطابق کر سکیں؟ اس لیے ہمیں پہلے وہ تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن سے ہر شعبۂ زندگی کے لیے موزوں معماروں اور لیڈروں کی ایک کھیپ تیار ہو جائے۔ پھر تبدیلیٔ قیادت کی جدوجہد با موقع بھی ہوگی اور نتیجہ خیز بھی۔

یہ استدلال خود ظاہر کر رہا ہے کہ اس سارے معاملے کو بڑے ہی سطحی انداز میں سوچا گیا ہے۔ اس کی پشت پر کئی غلط مفروضے کام کر رہے ہیں۔ جن لوگوں کے ذہن میں یہ استدلال پیدا ہوا ہے انھوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ یہاں صرف تبدیلیٔ قیادت کے لیے ایک سیاسی جدوجہد کی جا رہی ہے، اس کے ساتھ کوئی تحریک ذہنی و فکری اور اخلاقی تبدیلی کے لیے کام کرنے والی نہیں ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرض کر لیا ہے کہ سیاسی جدوجہد سے انقلاب قیادت اچانک رونما ہو جائے گا اور یکبارگی یہ سوال عملاً ہمارے سامنے آ کھڑا ہوگا کہ زمامِ کار تو اسلامی نظام کے حامیوں کے ہاتھ میں آ گئی ہے، اب اس نظام کے مطابق تعمیر نو کے لیے آدمی کہاں سے لائے جائیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے ایک تیسری بات یہ بھی فرض کر لی ہے کہ نظامِ زندگی کی تبدیلی کے لیے جو تحریک کسی ملک میں کام کر رہی ہو اسے پہلے کہیں الگ بیٹھ کر اپنے نظامِ مطلوب کے لیے آدمی تیار کرنے چاہئیں اور جب اس کے پاس مختلف شعبوں کو چلانے کے لیے ڈائرکٹروں، مدبّروں، سپہ سالاروں، اور دوسرے ماہرین کی ایک کافی تعداد تیار ہو جائے تب اسے نظامِ مملکت کا چارج لینے کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔ یہ تین مفروضے جب تک صحیح نہ ہوں، ان پر تعمیر کردہ استدلال صحیح نہیں ہو سکتا، اور میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص تھوڑے سے غور و فکر سے بھی کام لے گا وہ محسوس کرے گا کہ یہ تینوں ہی مفروضے غلط ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اچانک تبدیلی تو خفیہ سازشی تحریکوں اور مسلح انقلاب کے ذریعہ سے ہی کم رونما ہوتی ہے، کجا کہ جمہوری راستوں سے رونما ہو جائے۔ اصول اور نظریات کی بنیاد پر نظامِ زندگی کی تبدیلی کے لیے جو تحریکیں جمہوری اور آئینی طریقوں سے جدوجہد کرتی ہیں ان کے نتیجے میں ہر تبدیلی تدریجی اور رفتہ رفتہ ہوتی ہے اور کبھی یکبارگی یہ سوال ان کے لیے پیدا نہیں ہوتا کہ نظام تو بدل گیا ہے مگر اس کے

چلانے والے آدمی موجود نہیں ہیں۔ واقعات کی دنیا میں صورت معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے یعنی نظام بدلتا ہی اس وقت ہے جبکہ آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کی رائے، ذہنیت، طرزِ فکر، اور معیار پسند و ناپسند میں تغیر رونما ہو جاتا ہے۔ اور یہ تغیر آپ سے آپ اس بات کی ضمانت ہوتا ہے کہ اسی آبادی میں سے، جس نے یہ تغیر قبول کیا ہے، نئے نظام کو چلانے والے آدمی فراہم ہو جائیں گے۔

اس تغیر کی رفتار بہت سست ہوتی ہے جبکہ اس کے لیے کوشش کرنے والی تحریک زندگی کے بھڑکتے ہوئے مسائل و معاملات میں دخل دینے اور مخالف تحریکوں اور طاقتوں کے ساتھ زور آزمائی کرنے سے گریز کرے۔ کیونکہ اس صورت میں تھوڑے لوگ ہی اس کو مجرد اس کے خیالات اور اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی تعمیری کوششوں کی بنا پر قابلِ اعتنا سمجھتے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنے نظریات کی تبلیغ و دعوت کے ساتھ آگے بڑھ کر ہر عملی مسئلے میں دخل دیتی ہے، اس میں اپنا نقطۂ نظر دلائل کے ساتھ پیش کرتی ہے، مخالف قوتوں کی فکر و عمل پر مدلل تنقید کرتی ہے، اور عملاً ان قوتوں کے مقابلہ میں کشمکش شروع کر دیتی ہے، تو روز بروز آبادی کا زیادہ سے زیادہ حصہ اس کی طرف متوجہ ہوتا چلا جاتا ہے اور اگر اس کی تنقید اور تعمیری فکر اور سیرت و کردار میں کوئی جان ہوتی ہے تو ہر شعبۂ زندگی میں کام کرنے والے لوگ اس کے ہم خیال بنتے چلے جاتے ہیں۔ کشمکش، اور خصوصاً جبکہ وہ زندگی کے عملی مسائل پر ہو، لمبی چوڑی کتابوں کے بغیر خود لوگوں کو یہ سمجھا دیتی ہے کہ آپ جس چیز کو توڑنا چاہتے ہیں اس میں کیا خرابی ہے اور جو کچھ بنانا چاہتے ہیں وہ کیا ہے اور کن اصول و نظریات پر مبنی ہے۔ اس کا کم از کم ایک واضح خلاصہ ہر اس شخص کا ذہن اخذ کر لیتا ہے جو ماحول میں سانس لے رہا ہو، اور کشمکش جتنی بڑھتی جاتی ہے اتنے ہی زیادہ لوگ اس سے متاثر ہو کر اپنی اپنی استعداد کے مطابق تبدیلی قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔

اس طرح کی ایک تحریک کو کبھی اس کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ کہیں باہر سے آدمی تیار کر کے لائے۔ وہ اپنی تبلیغ اور اپنی جدوجہد کی تاثیر سے بنے بنائے آدمیوں کو تبدیل (CONVERT) کر کے اپنا ہم خیال و ہمنوا بنا لیتی ہے، اور اس کی یہ تبلیغ اور جدوجہد چونکہ کسی خلا میں نہیں ہوتی بلکہ اسی معاشرے میں ہوتی ہے، اس لیے کوئی شعبۂ حیات ایسا نہیں رہ جاتا جس میں کام کرنے والے لوگ اس کے پھیلائے ہوئے اثرات سے کم و بیش

متأثر نہ ہوتے ہوں یہی متأثرین اُس وقت کام آتے ہیں جب تحریک کی تدریجی ترقی سے ایک وقت عملاً قیادت تبدیل ہو جاتی ہے۔

پھر یہ خیال بھی غلط ہے کہ کسی نظام کو چلانے والے لوگ کہیں الگ سے تیار کر کے لائے جا سکتے ہیں۔ یہ چیز کسی کارخانے میں ڈھلنے والی یا کسی معمل (لیبارٹری) میں تیار ہونے والی نہیں ہے۔ برسوں کے تجربے اور عملی کام سے اس طرح کے لوگ تیار ہوا کرتے ہیں۔ اس سوال کو تھوڑی دیر کے لیے جانے دیجیے کہ آپ وہ وسائل کہاں سے فراہم کریں گے جن سے اعلیٰ درجے کے مدبرین و منتظمینِ مملکت تیار کرنے والے ادارے قائم کر سکیں۔ اس کو ممکن تسلیم کر کے بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ان اداروں میں تعلیم و تربیت پائے ہوئے لوگ کیا پہلا ہی قدم ہر شعبے اور محکمے کی مسندِ صدارت پر رکھنے کے قابل ہوں گے؟

مزید برآں ہمارا ملک جس جمہوری طرز پر چل رہا ہے، اس میں نظامِ زندگی کی تبدیلی لانے کے لیے بہرحال یہ ناگزیر ہے کہ ہمارے ارکان اور متفقین کی ایک کثیر تعداد عملاً اس جمہوری طرزِ حکومت کی پوری مشینری سے واقف ہو اور اس کے کام چلانے میں مہارت پیدا کرے۔ یہ واقفیت اور مہارت کہیں باہر سے حاصل کر کے نہیں لائی جا سکتی، اسی کام میں پڑ کر بتدریج پیدا کی جا سکتی ہے۔ انتخابی کام کے تجربہ کار خود انتخابات ہی میں تیار ہوں گے۔ پارلیمنٹیرین پارلیمنٹ میں جا کر ہی بنیں گے۔ حکومت کے مختلف شعبوں میں بصیرت اسی وقت پیدا ہو گی جبکہ ایوانِ ریاست میں جا کر آپ کے کارکنوں کو براہِ راست ملکداری کے مسائل و معاملات سے دوچار ہونے کا موقع ملے۔ اس کام کو جتنی مدت بھی آپ چاہیں ملتوی کر لیں، بہرحال جب بھی آپ اس طرف آئیں گے بسم اللہ ہی سے آپ کو آغاز کرنا پڑے گا۔ کوئی وقت ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ ساری مہارتیں اور بصیرتیں کہیں سے پیدا کیے ہوئے آئیں اور آتے ہی بس مملکت کا چارج لے لیں۔

اب رہ جاتا ہے یہ مفروضہ کہ یہاں محض سیاسی جدوجہد ہی سے قیادت کی تبدیلی چاہی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ کوئی متوازی کوشش ذہنی و فکری اور اخلاقی تبدیلی کے لیے نہیں ہو رہی ہے، تو اس کے متعلق میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ خلافِ حقیقت باتوں پر استدلال کی عمارت اٹھانا اُس نقطۂ نظر کی کمزوری کا پہلا نشان ہے جس کے حق میں استدلال کا یہ طریقہ اختیار کیا جائے۔ آخر کون آدمی، جو جماعت اسلامی کے

حالات سے واقف ہے، انصاف کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم آج تک محض سیاسی جدوجہد کے ذریعہ سے تبدیلیِ قیادت کے لیے کوشاں رہے ہیں؟ اور کون ہمارے اس چار نکاتی لائحہ عمل کو، جو اس وقت زیرِ بحث ہے، یہ معنی پہنا سکتا ہے کہ آئندہ کے لیے ہم ایسا کوئی نقشۂ کار بنا رہے ہیں؟ ہمارا تو سادہ منصوبہ یہی ہے کہ ایک طرف منظم طریقے سے وسیع پیمانے پر ذہنی و فکری اور اخلاقی تبدیلی لانے کی کوشش کی جائے، دوسری طرف قیادت بدلنے کے لیے سیاسی میدان میں لادینی نظام کی ان طاقتوں کے خلاف کشمکش کی جائے جو اس وقت زمامِ کار پر قابض ہیں یا آئندہ قابض ہونا چاہتی ہیں۔ اور یہ منصوبہ ہم نے اختیار ہی یہ سمجھتے ہوئے کیا ہے کہ اس طرح جس تدریج کے ساتھ زمامِ کار تبدیل ہوگی اسی کے مطابق ساتھ کے ساتھ نئے نظام کے چلانے والے بھی تیار اور فراہم ہوتے چلے جائیں گے۔ اب اگر کوئی شخص اس منصوبے سے سیاسی جدوجہد کے عنصر کو نکالنا چاہتا ہو تو اسے سیدھی طرح یہ بتانا چاہیے کہ وہ کیسے اور کہاں وہ مردانِ کار تیار کرے گا جن کی تیاری و فراہمی اس کی رائے میں سیاسی جدوجہد شروع کرنے کے لیے شرطِ مقدم ہے۔ یہ سیدھی راہ چھوڑ کر ایک بالکل خلافِ واقعہ مفروضے کا سہارا لینا کسی طرح درست نہیں ہے۔

تیسری وجہ | ایک اور وجہ اس تجویز کے لیے یہ بیان کی جاتی ہے کہ ابھی تو ہم نے علمی میدان میں اُس درجے اور پیمانے کا کوئی کام کیا ہی نہیں ہے جو فکری و نظری قیادت بدلنے کے لیے کافی ہو سکے۔ اور فکری و نظری قیادت بدلے بغیر سیاسی قیادت بدلنا نہ تو ممکن ہی ہے اور نہ مفید۔ اس لیے ہمیں سیاسی قیادت کی تبدیلی کا خیال چھوڑ کر اپنی پوری قوت علمی کام پر صرف کرنی چاہیے۔ آخر کار جب ہم علوم و فنون کی وہ ساری بنیادیں ڈھا دیں گے جو موجودہ لادینی تہذیب کی اساس بنی ہوئی ہیں، اور ان کی جگہ اسلامی افکار کی نئی بنیادیں علوم کی تدوینِ جدید کے ذریعہ سے مستحکم کر دیں گے، تو اس سے خود بخود ایک انقلاب رونما ہوگا جو سیاست سمیت ہر شعبۂ زندگی میں قیادت کو تبدیل کر دے گا۔

یہ دراصل ایک دوسری ہی نوعیت کا نقشۂ کار ہے جسے اگر اختیار کرنا ہو تو آپ کو اپنی تحریک کے لائحہ عمل سے اس کا صرف چوتھا جز ہی خارج نہیں کرنا ہوگا، بلکہ باقی تینوں اجزاء کو بھی ختم کر دینا ہوگا۔ کیونکہ اس نقشے کی رو سے تو دعوتِ عام، تنظیمِ افرادِ صالح، اور اصلاحِ معاشرہ کا کام بھی قبل از وقت اور محض لاحاصل ہے۔

یہی نہیں، بلکہ تب پچھلے پندرہ بیس سال میں ہم اپنے نصب العین کے لیے جو کچھ بھی کرتے رہے ہیں وہ سب فضول تھا اور محض ناسمجھی کی وجہ سے ہم ایک غلط راستے پر پڑ گئے تھے۔ اس کے بجائے جو کچھ ہمیں کرنا چاہیے تھا اور جو کچھ اب کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ایک عظیم الشان اکیڈیمی قائم کریں جو علوم کی تحقیق و تنقید اور تدوینِ جدید کا کام شروع کرے، پھر جب یہ اکیڈیمی اپنے نتائجِ عمل سے ہم کو اس حد تک مسلح کر دے کہ ہم ایک یونیورسٹی قائم کر سکیں تو ہمیں دوسرا قدم اُس کی تاسیس کا اٹھانا چاہیے۔ اس کے بعد جو کچھ کرنا ہوگا اسے ابھی سے سوچنے کی کوئی حاجت نہیں، کیونکہ ۶۰-۷۰ برس تک کے لیے تو یہ پروگرام ہمارے پاس موجود ہی ہے! رہی یہ بات کہ ایک نظام کی گود میں بیٹھ کر دوسرے نظام کے لیے یہ انقلاب انگیز تعمیری ادارے کہاں کن وسائل سے قائم ہونگے، اور غالب نظام کا ہمہ گیر استیلا ان کو کام کرنے کا موقع کس حد تک دیگا، اور خود اس نظامِ غالب کے اپنے وسیع و عمیق علمی و فکری اثرات اس مدت میں کس پیمانے پر اپنا کام کر چکے ہونگے، تو یہ وہ سوالات ہیں جو اس عالمِ خیال میں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے جہاں بیٹھ کر یہ نقشۂ کار سوچا گیا ہے۔

دراصل یہ محض ایک سرسری تخیل ہے جسے اچھی طرح سمجھے بغیر اور پھر غور و فکر کی زحمت اٹھائے بغیر ناپختہ حالت میں پیش کر دیا گیا ہے۔ میں چند الفاظ میں اس پر تنقید کر کے بتاؤں گا کہ اس میں خامی کیا ہے، اور جس چیز کی ضرورت کا اس میں اظہار کیا جا رہا ہے وہ ہماری تحریک میں پہلے ہی کس طریقے سے پوری ہو رہی ہے۔

اس میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ کسی نظریۂ حیات کے مطابق سیاسی انقلاب رونما ہونے کی واحد صورت یہ ہے کہ اس سے پہلے اُس نظریے کے مطابق فکری انقلاب رونما ہو جائے۔ حالانکہ ایسا ہونا کچھ ضروری نہیں ہے۔ خود ہمارے ملک میں انگریزوں نے آکر پہلے خالص سیاسی تدبیروں سے اقتدار پر قبضہ کیا، پھر اسی ملک کے ذرائع و وسائل سے کام لے کر اپنے نظریۂ حیات کے مطابق افکار، اخلاق، اطوار، تہذیب تمدن، ہر چیز کی دنیا بدل ڈالی۔ یہاں یہ فکری و تہذیبی انقلاب سیاسی انقلاب کی علت نہیں بلکہ اس کا نتیجہ تھا۔ اسلام کی اپنی تاریخ بتاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً صرف ایک مٹھی بھر جماعت اسلامی طرزِ فکر کی تیار کی تھی۔ اس کے بعد سیاسی انقلاب فکری و اخلاقی انقلاب کے ساتھ اس طرح متوازی چلتا رہا کہ دونوں کی تکمیل ایک ساتھ واقع ہوئی۔ وہاں ان دونوں قسم کی مساعی کو ہم ایک دوسرے کا ایسا مددگار پاتے ہیں کہ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آیا سیاسی انقلاب فکری و اخلاقی انقلاب کا نتیجہ تھا یا فکری و اخلاقی انقلاب

سیاسی انقلاب کا نتیجہ۔ اس لیے یہ بات ایک کلیہ کے طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ سیاسی انقلاب کے لیے فکری انقلاب لازماً ایک شرطِ مقدم ہے۔ در حقیقت جس چیز کو شرطِ مقدم کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ایک ایسا منظم گروہ پیدا ہو جائے جو ایک فکر کا حامل بھی ہو اور اس فکر کو عملی جامہ پہنانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ ایسا گروہ جب وجود میں آجائے تو پھر یہ امر حالات اور مواقع پر منحصر ہے کہ وہ اپنے مقصود کی طرف کس راستے سے بڑھے۔ اگر سیاسی تغیر ممکن ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ محض ایک خیالی نظریہ کی بنا پر وہ اس امکان سے فائدہ اٹھانے میں تامل کرے۔ وہ ایسا کر سکتا ہے کہ اقتدار اور وسائل کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد پورے نظامِ زندگی کو اپنے نقطۂ نظر کے رخ پر موڑنے کی ویسی ہی کوشش کرے جیسی انگریز یہاں بڑی کامیابی کے ساتھ کر کے دکھا چکے ہیں اور انبیائے کرام میں بھی اس طریقِ کار کی مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ میں ملتی ہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ فکری انقلاب اور سیاسی تغیر کی ایک ساتھ کوشش کرے یعنی جس قدر طاقت فکری دعوت پھیلانے سے حاصل ہو اسے سیاسی تغیر کے لیے استعمال کرے، اور جتنی طاقت سیاسی تغیر کی سعی و جہد سے حاصل ہو اس سے فکری انقلاب کو اور زیادہ وسیع و عمیق کرنے کی کوشش کرتا چلا جائے۔ یہ وہ طریقِ کار ہے جو ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا۔

دوسری ایک غلط بات اس خیالی نقشۂ کار میں یہ فرض کی گئی ہے کہ فکری انقلاب برپا کرنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم تحقیق و تدوینِ علوم کے ادارے قائم کر کے اپنے نظریۂ حیات کے مطابق ایک پورا نظامِ فکر تفصیلاً مرتب کر دیں، پھر اپنے تعلیمی ادارے قائم کر کے ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی پیدا کریں جو اس نظامِ فکر کے مطابق ذہنی تربیت پائے ہوئے ہوں۔ حالانکہ اس مقصد کے حصول کا یہی ایک طریقہ نہیں ہے۔ اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ہم جس نظام کو بدلنا چاہتے ہیں اس کی خرابیاں اور جس نظام کو لانا چاہتے ہیں اس کے امتیازی خدوخال مجمل مگر واضح اور مدلل و مؤثر طریقے سے پیش کر کے ایک عملی جدوجہد کا آغاز کر دیں۔ جو زندگی کے تمام اہم مسائل میں، جو وقتاً فوقتاً ملک کو درپیش ہوں، بروقت دخل دے کر اپنے نقطۂ نظر کی ترجمانی کریں، اور اسی بنیاد پر مخالف نظریات کے مقابلے میں اپنے نظریے کو غالب کرنے کی کوشش کرتے چلے جائیں، یہاں تک کہ یہ کشمکش اس قدر عام، اس قدر شدید، اور اس قدر نمایاں ہو جائے کہ معاشرے

کا کوئی طبقہ اس کی طرف توجہ کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اس طریقے سے لازماً ایک عام فکری حرکت رونما ہوگی جس سے معاشرے کے دوسرے طبقات کی طرح اہل علم، اہل قلم، اصحاب درس و تدریس، اور نظامِ تعلیم و تربیت بھی متاثر ہونگے۔ یہ حرکت جہاں کچھ لوگوں کو ہماری مخالفت پر اُبھاریگی، کچھ دوسرے لوگوں کا زاویۂ فکر و نظر ہماری موافقت میں بھی تبدیل کریگی۔ اور یہی بدلے ہوئے ذہن آخرکار خود اپنی افتادِ طبع سے وہ علمی اور تعلیمی خدمت انجام دینا شروع کر دیں گے جس کی ضرورت ظاہر کی جارہی ہے۔ ان میں سے جو جس شعبۂ علم سے متعلق ہوگا اور جس پوزیشن میں بھی کام کر رہا ہوگا، وہاں اس کی قابلیتیں اسی سمت میں کام کریں گی جس پر ایک ابتدائی فکری حرکت اسے موڑ چکی ہوگی۔ اس کے بعد جب یہ کشمکش اور زیادہ ترقی کرکے ملک کے سیاسی نظام میں تغیر پیدا کرنا شروع کر دیگی تو ہمیں اپنے ادارے الگ قائم کرنے کی حاجت نہ رہے گی۔ یہی محکمۂ تعلیم، یہی مدرسے، یہی کالج، یہی یونیورسٹیاں، اور مختلف قسم کی تربیتوں کے یہی سرکاری ادارے جو آج موجود ہیں وہ کام کرنے لگیں گے جس کے لیے ایک ادارۂ تحقیقات اور ایک درسگاہ کی ضرورت ظاہر کی جارہی ہے۔

اب یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ ہم کئی سال سے اسی دوسرے طریقے پر فکری انقلاب لانے کی کوشش کر رہے ہیں، اور ہماری یہ کوشش ایک طرف عمومی اصلاح اور دوسری طرف سیاسی تغیر کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ متوازی چل رہی ہے۔ اگر عملاً یہ ممکن ہوتا اور اس کے لیے ذرائع و وسائل ہم پہنچتے تو ہم صرف ایک نہیں متعدد تحقیقی اور تعلیمی ادارے اب تک قائم کر چکے ہوتے۔ آج بھی اس کے مواقع ہمیں مل جائیں تو ہم یہ کام کرنے میں ایک لمحے کے لیے بھی تامل نہ کریں۔ کیونکہ یہ کام ہماری اسکیم میں شامل ہے اور اس کی ضرورت اور اس کے فوائد سے ہم نہ کبھی غافل تھے، نہ اب غافل ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ کام [illegible] مفید ہے جبکہ یہ اس ہمہ گیر اصلاح و تغیر کی جدوجہد کے ساتھ چلے جس میں ہم کئی سال سے منہمک ہیں۔ اس کو چھوڑ کر صرف ایک ہی کام پر اپنی مساعی کو مرکوز کر دینا ہماری نگاہ میں ایک بڑی نادانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے اب تک کیا ہے وہ بھی ضائع ہو اور جو کچھ ہم آگے بنانا چاہیں وہ بھی شاید نہ بنا سکیں۔

یہ ہے ان وجوہ و دلائل کی کل کائنات جو تحریکِ اسلامی کے لائحۂ عمل میں سے اس کے سیاسی جزء کو خارج یا سرِدست ملتوی رکھنے کے حق میں اب تک مجھے معلوم ہو سکے ہیں۔ ان کے سوا اگر اور بھی کچھ وجوہ ہوں تو ہم سب ضرور ان کو معلوم کرنا چاہیں گے اور ٹھنڈے دل سے ان پر غور کریں گے۔ لیکن یہ وجوہ، جن پر ابھی میں نے آپ کے سامنے تبصرہ کیا ہے، ایسی کسی تجویز کے لیے میرے نزدیک کسی پہلو سے بھی کافی نہیں ہیں۔ بہرحال آخری فیصلہ اجتماعِ ارکان کے اختیار میں ہے کہ وہ انہیں کافی تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔

نکتۂ ہشتم اس بحث کے بعد قرارداد کے آٹھویں نکتے پر کچھ زیادہ گفتگو کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔ جس میں دو باتوں پر خاص زور دیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ لائحۂ عمل کے ان چاروں اجزاء پر توازن کے ساتھ کام کرنا ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ توازن قائم نہ رہنے کو کسی حالت میں اس امر کے لیے دلیل نہ بنایا جا سکے گا کہ ان اجزاء میں سے کسی جزء کو ساقط یا مؤخر کر دیا جائے۔

ان میں سے پہلی بات کے متعلق صرف یہ کہنا کافی ہے کہ یہ لائحۂ عمل جس اسکیم پر مبنی ہے اس کی کامیابی کا سارا انحصار ہی اس کے توازن پر ہے۔ اس کا ہر جزء دوسرے اجزاء کا مددگار ہے، اس سے تقویت پاتا ہے اور اس کو تقویت بخشتا ہے۔ آپ کسی جزء کو ساقط یا معطل کریں گے تو ساری اسکیم خراب ہو جائے گی۔ اور اس کے اجزاء کے درمیان توازن برقرار نہ رکھیں گے تب بھی یہ اسکیم خراب ہو کر رہے گی۔ کامیابی کی صورت صرف یہ ہے کہ ایک طرف دعوت و تبلیغ پیہم جاری رکھیے تاکہ ملک کی آبادی زیادہ سے زیادہ آپ کی ہم خیال ہوتی چلی جائے۔ دوسری طرف ہم خیال بننے والوں کو منظم اور تیار کرتے جائیے تاکہ آپ کی طاقت اسی نسبت سے بڑھتی جائے جس نسبت سے آپ کی دعوت وسیع ہو۔ تیسری طرف معاشرے کی اصلاح و تعمیر کے لیے اپنی کوششوں کا دائرہ اتنا ہی بڑھاتے چلے جائیے جتنی آپ کی طاقت بڑھے، تاکہ معاشرہ اس نظامِ صالح کو لانے اور سہارنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تیار ہوتا جائے جسے آپ لانا چاہتے ہیں۔ اور چوتھی جانب ملک کے نظام میں عملاً تغیر لانے کے جو آئینی ذرائع موجود ہیں ان سے پورا پورا کام لینے کی کوشش کیجیے تاکہ ان تغیرات کو لانے اور سہارنے کے لیے آپ نے معاشرے کو جس حد تک تیار کیا ہو اس کے مطابق واقعی تغیر رونما ہو سکے۔ ان چاروں کاموں کی مساوی اہمیت آپ کی نگاہ میں ہونی چاہیے۔ ان میں سے

کسی کو کسی پر ترجیح دینے کا غلط خیال آپ کے ذہن میں پیدا نہ ہونا چاہیے۔ ان میں سے کسی کے بارے میں غلو کرنے سے آپ کو پرہیز کرنا چاہیے۔ آپ کے اندر یہ حکمت موجود ہونی چاہیے کہ اپنی قوتِ عمل کو زیادہ سے زیادہ صحیح تناسب کے ساتھ ان چاروں کاموں پر تقسیم کریں۔ اور آپ کو وقتاً فوقتاً یہ جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ ہم کہیں ایک کام کی طرف اس قدر زیادہ تو نہیں جھک پڑے ہیں کہ دوسرا کام رک گیا ہو، یا کمزور پڑ گیا ہو۔ اسی حکمت اور متوازن فکر اور متناسب عمل سے آپ اُس نصب العین تک پہنچ سکتے ہیں جسے آپ نے اپنا مقصدِ حیات بنایا ہے۔

اب رہی دوسری بات جو اس نکتے میں کہی گئی ہے، تو اسے سمجھنے کے لیے کچھ بہت زیادہ غور و فکر کی بھی حاجت نہیں ہے۔ ایک سیدھی اور صاف بات ہے جسے سیدھے اور صاف طریقے سے ہر صاحبِ عقل آدمی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ توازن ایک عقلی چیز ہے، کوئی مادی چیز نہیں ہے جسے ناپ تول کر فیصلہ کیا جا سکے کہ وہ برقرار رہا یا نہ رہا۔ ایک شخص جماعت کے حالات اور کام کو دیکھ کر یہ اندازہ کر سکتا ہے، کہ وہ برقرار نہیں رہا ہے۔ دوسرا شخص یہی سب کچھ دیکھ کر رائے قائم کر سکتا ہے کہ وہ پوری طرح برقرار ہے، یا اُس سے زیادہ نہیں بگڑا ہے جتنا اجتماعی کاموں میں اس کا بگڑ جانا ایک فطری امر ہے۔ ایسی ایک چیز کو، جس کا مدار اندازوں پر ہو، اور جس میں مختلف لوگوں کے اندازے مختلف ہو سکتے ہوں، اس حد تک اہمیت دینا صحیح نہیں ہو سکتا کہ جماعت میں ہر وقت اس کی بنیاد پر لائحہ عمل کی شکست و ریخت کا دروازہ کھلا رہے اور آئے دن اس کے بدلنے اور نئے سرے سے بنانے کی کششیں اٹھتی رہیں۔ تاہم اگر توازن کے متعلق ناپ تول کر کوئی ایسا فیصلہ کرنا ممکن بھی ہو جس میں دو رایوں کی گنجائش نہ رہے، تب بھی ایک قسم کے عدمِ توازن کو دوسری قسم کا عدمِ توازن پیدا کرنے کے لیے دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے وہ بس یہی ہے کہ اگر توازن بگڑ گیا ہے تو اس کو پھر سے قائم کرنے کی کوشش کی جائے، نہ یہ کہ اگر اب تک ایک رُخ پر توازن بگڑ رہا ہے تو اب اسے دوسرے رخ پر بگاڑ دیا جائے۔

اس معاملے کو آپ ایک مثال سے بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ایک نسخہ ہے جس میں چار اجزاء مساوی الوزن رکھے گئے ہیں۔ کچھ مدت کے بعد آپ پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ آپ ایک جز کی مقدار بہت زیادہ

استعمال کرتے رہے ہیں اور بقیہ تین اجزاء کا تناسب آپ کے زیرِ استعمال مرکب میں کم ہو گیا ہے۔ اب کوئی اناڑی طبیب ہی ہوگا جو آپ کو یہ مشورہ دے گا کہ آئندہ چھ مہینے تک آپ صرف وہی تین اجزاء استعمال کرتے رہیں جو مقررہ مقدار سے کم استعمال ہوتے ہیں، اور چوتھے جزء کو سرے سے ساقط کر دیں۔

اس توازن کی بحث میں غلط فہمی کی ایک اور وجہ بھی ہے جسے نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ عموماً جب کوئی صاحب یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جماعت کے کام میں لائحہ عمل کے چاروں اجزاء کا توازن قائم نہیں رہا ہے تو ان کی گفتگو سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اس کے ہر جزء پر عمل صرف وہی ہے جو اُس خاص جزء کے نام سے کیا جائے۔ مثلاً دعوت کا کام وہ صرف اُس کو شمار کریں گے جس پر "دعوت" کا نام لگا ہوا ہو، اور اصلاحِ معاشرہ کا کام اُن کے خیال میں صرف وہ ہوگا جو اسی مخصوص نام کے ساتھ کیا گیا ہو۔ رہے وہ کام جن پر "سیاست" کا عنوان چسپاں ہو تو وہ اسے "سیاسی کام" کے خانے میں ڈال دیں گے اور یہ تسلیم نہ کریں گے کہ اس عنوان کے تحت دعوت، توسیعِ تنظیم، اور اصلاحِ معاشرہ کا بھی کوئی کام ہوا ہے۔ اس طرح بعض لوگوں نے مختلف عنوانات کے خانوں میں جماعت کے کام کو تقسیم کر رکھا ہے اور زیادہ تر یہی چیز اُن کے اس دعوے کی بنیاد ہے کہ جماعت کا سیاسی کام اس کے دوسرے کاموں سے بہت بڑھ گیا ہے۔ حالانکہ ہم جو اپنے لائحہ عمل میں چار عنوانوں پر کام کو تقسیم کر کے بیان کرتے ہیں تو وہ صرف یہ سمجھانے کے لیے ہے کہ زندگی کے کن کن گوشوں میں ہمیں کن مقاصد کے لیے سعی کرنی ہے۔ اس کا یہ مطلب کبھی نہیں ہوتا، اور نہیں ہو سکتا کہ عملاً بھی یہ الگ الگ کام ہوں گے۔ واقعہ کے اعتبار سے تو ان میں سے ہر کام ایسا ہے جس میں آپ سے آپ بقیہ سارے کام بھی شامل ہوتے ہیں۔ جب آپ دعوت کا کام کریں گے تو وہ مذہبی واعظوں کے طرز پر صرف دعوت ہی نہ ہوگی بلکہ توسیعِ نظام اور اصلاحِ معاشرہ کا مقصد بھی اس کے ساتھ خود بخود پورا ہوگا اور یہی آپ کا سیاسی کام بھی ہوگا۔ دوسری طرف جب آپ سیاسی کام کرنے اٹھیں گے تو یہ دوسری سیاسی پارٹیوں کے طرز پر محض سیاسی کام ہی نہ ہوگا، بلکہ اس کا افتتاح ہی دعوتِ دین سے لیا جائے گا، اور اس کے اندر لازماً توسیعِ نظام اور اصلاحِ معاشرہ کے عناصر بھی شامل ہوں گے۔ مثال کے طور پر اُس انتخابی کام کو لیجیے جو ۱۹۵۱ء میں ہم نے کیا تھا۔ اس کے متعلق اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ صرف سیاسی

کام تھا تو یہ اس کی اپنی سمجھ کا قصور ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس انتخابی مہم میں دعوتِ دین پھیلانے کا کام جتنے وسیع پیمانے پر کیا گیا تھا اس کی کوئی دوسری مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ اُس وقت جو منشور شائع کیا گیا تھا اسے پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ اگر اس پر دعوت کا اطلاق نہ ہوتا ہو تو میں نہیں سمجھتا کہ پھر کس چیز پر اس نام کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اور اُس وقت جو تقریریں کی گئی تھیں ان کے مضامین پر بھی غور کر لیجیے۔ آخر ان میں سے کونسی تقریر دین کی بنیادی دعوت سے خالی تھی؟ اسی طرح اُس وقت انتخابی مہم کی بدولت نظامِ جماعت کی توسیع کا جو کام ہوا وہ بھی تو آخر کار دور دراز کے دیہاتی علاقوں تک میں مستقل حلقہ ہائے متفقین کی تنظیم کا ذریعہ بنا۔ پھر اصلاحِ معاشرہ کا اس سے بڑا کام اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس انتخابی مہم میں سابق پنجاب کی ڈیڑھ ہزار بستیوں کے پچاس ہزار باشندوں کو اس بنیاد پر منظم کر لیا گیا کہ وہ اسلامی نظام کے قیام کا مقصد سامنے رکھ کر اپنی نمائندگی کے لیے نیک آدمی تلاش کریں، اور کم از کم ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کو اس بات پر آمادہ کر لیا گیا کہ حکومت کے دباؤ، زمینداروں کے دباؤ، برادری کے تعصب اور روپے کے لالچ سے آزاد ہو کر خالص اصول کی خاطر اچھے آدمیوں کے حق میں رائے دیں۔ معاملے کے اس پہلو کو نگاہ میں رکھا جائے تو ان لوگوں کی رائے اور بھی زیادہ کم وزن رہ جاتی ہے جو توازن و عدمِ توازن کے سوال پر لائحہ عمل کی شکست و ریخت کا دروازہ مستقلاً کھلا رکھنا چاہتے ہیں۔

(باقی)